اسلوبِ سیّدی سیّد والا گہر کے کمالاتِ نثری

مظفر حسین سیّد

29/11، سرسیّد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی110002، موبائل: 9818827853

سیّد عالی قلم بابائے اردو نثر ہیں، صاحبِ اسلوب ہیں، ایک جدید اسلوب کے موجد و بانی ہیں۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ اسلوب خیال کا سایہ ہے، لیکن سیّد والا رقم کے یہاں اسلوب خیال کا سایہ نہیں، بلکہ خیال کا پیکر ہے۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایسا طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ نہ ثقالت آڑے آتی ہے نہ ابہام و ابہام، بلکہ ان کی نثر کی سادگی و دل نشینی ذریعۂ ابلاغ بن جاتی ہے اور ان کے تحریر کردہ سلیس، مگر بامعنیٰ الفاظ قلب و ذہن میں جاگزیں ہوجاتے ہیں، سیّد خوش رقم کے یہاں وسیلۂ اظہار اہم نہیں بلکہ کمالِ ترسیل اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ بات اتنی عام فہم اور سادہ زبان میں ادا کی جائے کہ خواص ہی نہیں بلکہ متوسطین اور عوام، غرض معاشرے کے تمام افراد کے لیے یکساں طور پر قابلِ فہم ہو۔ سیّد والا خیال کی رائے میں نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پُر اثر انداز میں اپنا مدعا بیان کر سکے۔

موصوف علمیت، فضیلت اور دانشوری کے علم بردار ہیں۔ ان کی تمام تحریریں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ سیّد والا مرتبت صاحبِ ترقیم بھی ہیں، صاحبِ تسوید بھی اور صاحبِ تسدید بھی۔ ان کی نثر میں تخلیقی عنصر بھلے ہی نہ ہو، مگر معنیٰ آفرینی خوب ہے۔ دراصل ان کی تحاریر کی اساس خلوص نیت پر ہے، اس لیے ان کا تحریر کردہ ایک ایک لفظ اپنی جگہ ایک صدف اور ہر حرف تابدار ہے جس کی آب تغیر زمانہ کے ساتھ کم نہیں ہوتی، لہٰذا جوہر شناسوں کی نظر میں اس کی قیمت میں ذرا بھی تخفیف واقع نہیں ہوتی۔

سیّد والا نظر کی تحاریر سادگی میں پُرکاری کا نمونۂ اعلیٰ ہیں، وہ جو رقم کرتے ہیں بے تکلف و بے محابا کرتے ہیں۔ ان کا خامہ صفحۂ قرطاس پر تیزی کے ساتھ، بے روک ٹوک چلتا ہے۔ سیّد عالی صفت کو اپنا مقصد جلیل عزیز ہے، اسی لیے ان کی تحریرات پر مقصدیت حاوی ہے اور اپنے مقصد علوی کی برآوری میں وہ نہ قواعد کی پروا کرتے ہیں، نہ معیارِ زبان کی، اپنی بات کو فطری، سہل و سہج انداز میں کہتے چلے جاتے ہیں، ان کا مقصدِ عین قاری کو زبان و بیان سے متاثر کرنا نہیں، بلکہ اس تک اپنے نقطۂ نظر کی ترسیل کرنا ہے۔

سیّد والا نے بقول شخصے میلوں کاغذ پر اپنے قلم کا جادو جگایا ہے، وہ ہمہ وقت قلم زنی میں مصروف رہتے تھے، اس لیے ان کے پاس شاید اتنا وقت ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے مسودے کو صاف کر لیں یا دوبارہ تحریر کریں، بس جو لکھ دیا وہی حرفِ آخر تھا۔ سیّد عالی فکر کی تحریر کی ایک خوبی یہ ہے کہ تمام تر زود نویسی اور کثرتِ نگارشات کے باوصف ان کے یہاں معنیٰ آفرینی قائم رہتی ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ عباراتِ سیدی میں ایک جہانِ معنیٰ آباد ہے۔

سیّد والا قلم کی نثر، ان کی انشا پردازی نیز ان کے اسلوب نگارش کے تجزیے سے پیشتر ان کے عصر ماقبل کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لینا مقتضائے موضوع ہے نیز ان کی ادبی تحریک کے پس منظر کا مشاہدہ شرط اوّل ہے۔ لائق توجہ ہے کہ ماقبل سیّد والا صفت، اردو کا نثری ادب خاصا محدود تھا اور اس کے موضوعات بھی چند تھے، یعنی مذہب، تصوف، داستان، تدوین تاریخ اور تذکرہ نویسی ہی اردو نثر کے محور و مرکز تھے۔ یہ نثر 'ادب برائے تفریح' کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ مذہب کے باب میں کافی تصانیف تھیں، مگر دنیاوی علوم پر تصنیفات و تالیفات کا فقدان تھا اور اگر چند تھیں بھی تو تحقیق و جستجو سے محروم تھیں۔ تاریخ نویسی میں بھی روایتی طریقہ مروج تھا۔ سرسری واقعہ نگاری کا نام تاریخ تھا۔ تنقید کے نام پر تذکرہ نویسی تھی، جس میں یا تو سرسری احوال تھا یا پھر جانب داری کا دور دورہ تھا۔

ادوار تصنیف کے اعتبار سے ان کی حیاتِ تصنیف و تالیف کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: اولاً مذہبی تصانیف کا دور، جن میں رسالہ 'جلاء القلوب بہ ذکر محبوب'، 'نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ'، کلمۃ الحق اور تحفۂ حسن' نمایاں ہیں۔ دوئم تاریخی تالیفات کا دور، جن میں اہم ترین کتب ہیں: 'سلسلۃ الملوک'، 'تاریخ فیروز شاہی'، آئین اکبری۔ سوئم، معاشرتی و اصلاحی نگارشات، جن کا مظہر ان کے وہ تمام مضامین ہیں جو 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوئے۔ ان کی صحافتی خدمات اس کے علاوہ ہیں۔ انھوں نے اپنے برادرِ بزرگ کے اخبار 'سیّد الاخبار' کے توسّط سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اگرچہ ان کی وہ نگارشات دستیاب نہیں ہیں، تاہم تمام محققین نیز ماہرین مطالعاتِ سیّد کا خیال ہے کہ وہ اس

اخبار میں مضامین بھی لکھتے تھے اور اداریے بھی۔ بعد ازاں ان کے برادرِ اکبر کی وفات کے بعد انھوں نے 'سیّد الاخبار' کی ادارت سنبھالی اور پورا پورا اخبار تنہا اپنے دم پر لکھا اور شائع کیا۔ ان کا یہی شوقِ صحافت نشو ونما پا کر نہال سے شجر بنا اور اولاً 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور ثانیاً 'تہذیب الاخلاق' کی شکل میں جلوہ گر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیّد عالی مقام، جس طرح اردو میں نثر جدید کے بانی ہیں اسی طرح وہ اردو صحافت کے بانی اوّل نہ سہی، یکے از بانیان ضرور ہیں۔ اگرچہ ان سے پہلے دہلی میں مولوی باقر کا 'دہلی اردو اخبار' اور لکھنؤ میں منشی نول کشور کا 'اودھ اخبار' منظرِ عام پر آ چکے تھے، لیکن بطور مدیر وصحافی جو دھوم سیّد کثیر جہات نے مچائی، وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کے ذریعہ جاری کردہ ہر دو جریدے اردو صحافت کا اہم سنگِ میل ہیں، وہ اردو میں نہ صرف مضمون نگاری، بلکہ اداریہ نگاری کے بھی مؤسس ہیں۔

سید عالی قلم نے کئی اصناف اُردو اوّلاً رائج کی ہیں، مثلاً، وہ اُردو کے اوّلین، باقاعدہ مضمون نگار ہیں۔ ان سے قبل ہندوستان کے اخبارات میں اداریہ نہیں ہوتا تھا، بس مدیر صفحہ اوّل پر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایک مبسوط یا غیر مبسوط تحریر شائع کر دیا کرتا تھا۔ سید والا نے اپنے جرائد کے ذریعہ اداریہ نگاری کو رواج دیا۔ اسی طرح اُردو میں باقاعدہ خطوط نگاری کے موجد تو غالبؔ ہیں، مگر اس کی تشکیل نو، نیز توسیع کا سہرا سید عالی کے سر پر ہی بندھے گا۔ جیسا کہ عرض کیا، اردو میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی بھی سیّد والا گہر ہی ہیں۔

دراصل ادب کی یہ صنف یوروپ سے درآمد ہوئی اور اس کا انگریزی نام ایسّے ہے۔ جس کا اُردو ترجمہ انشائیہ ہوسکتا ہے اور سہل طور پر مضمون بھی، یورپ میں اس کو ادبی صنف بنانے والا ایک اطالوی ادیب مان تان تھا۔ انگلستان میں اس کو مقبول بنانے والے کئی ادیب تھے، جن میں بیکن، ڈرائڈن اور آگے چل کر ایڈیسن اور اسٹیل نمایاں ہوئے۔ جن کے دو صحیفے 'اسپکٹیٹر' اور 'ٹیٹلر' اس عہد میں شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے تھے۔ بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ سیّد عالی مؤخر الذکر دو ادیبوں سے خاصے متاثر ہوئے اور اغلباً 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا بھی انہی کے زیر اثر عمل میں آیا۔ سید والا نے کئی جگہ اپنی عبارات میں ان ہر دو ادبا کا ذکر بھی کیا ہے۔ تاہم یہ رائے قائم کرنا مناسب نہ ہوگا کہ سید والا کے مضامین مذکورہ ادبا کی تحریروں کا چربہ ہوتے تھے، اگرچہ انھوں نے کئی اچھے انگریزی مضامین کا آزاد ترجمہ بھی کیا، بلکہ مضمون نگار کے خیالات کو اپنے انداز میں از سرِ نو پیش کیا۔ اگرچہ بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ سید والا انگریزی کے مصنّفین ایڈیسن اور اسٹیل سے کچھ زیادہ متاثر نہیں تھے، بلکہ وہ دراصل انگریزی میں انشائیہ یعنی ایسّے کے بانی فرانسس بیکن سے کہیں زیادہ متاثر تھے اور اس کا واضح اثر ان کی نگارشات پر نظر آتا ہے مگر یہاں یہ نکتہ ملحوظ رکھنا لازم ہے کہ سید محترم کے مضامین اکثر طویل ہوتے ہیں اور بیشتر قیودِ مضمون نگاری سے مبّرا۔ جبکہ بیکن کا طرۂ امتیاز ارتکاز موضوع اور ممکنہ اختصار ہے اور سید مکرّم کے یہاں یہ وصف چند مضامین کے علاوہ بیّن طور پر موجود نہیں۔

سید عالی رقم نے انشائیے بھی لکھے اور مضامین بھی۔ دراصل انشائیے اور مضمون میں ایسا باریک فرق ہے کہ بعض دفعہ ان دونوں اصناف میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے اگرچہ دورِ سید کے بعد مضمون اور انشائیے کا فرق واضح ہوا، انشائیہ اُردو ادب میں ایک اہم صنف بن کر ابھرا اور مضمون بھی اپنی عموی شکل میں قائم رہا۔ سیاسی و معاشرتی مضامین عام طور پر اخباری نوعیت کے ہوتے ہیں، جبکہ انشائیہ ایک خاص موضوع اور بعض قیود کا پابند ہوتا ہے۔

انشائے سیدی پر گفتگو مقصود ہے تو اوّلاً ان کے مضامین پر ہی بات کرنا چاہیے۔ واضح طور پر سید والا کے مضامین تین اقسام کے قرار دیے جاسکتے ہیں، اول: خالصتاً مذہبی اور دینی مضامین۔ دوئم: اصلاحی و معاشرتی مضامین۔ سوئم سیاسی مضامین۔ یہاں یہ وضاحت لازم ہے کہ سید محترم کے تمام مضامین انشائیے کی تعریف پر پورے نہیں اترتے، لیکن ان کے متعدد مضامین ایسے ہیں، جو اپنی جگہ مکمّل انشائیہ ہیں، اس کی چند امثال یہ ہوسکتی ہیں: 'خوشامد، بحث وتکرار، تعصب، تعلیم وتربیت، کاہلی، مخالفت، سولزیشن، خود غرضی، قومی ہمدردی، سمجھ، آزادیِ رائے، سرابِ حیات' وغیرہ۔ یہ تمام انشائیہ نما مضامین 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوئے۔ ان تمام نگارشات میں ایک خاص قسم کا نظم وضبط موجود ہے، نیز موضوع پر مکمّل ارتکاز اور اکثر و بیشتر اختصار، ان تمام تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔ سید والا قلم کی کئی نگارشات، مثلاً 'امید کی خوشی' اور 'گزرا ہوا زمانہ' کے باب میں کئی اہل قلم کا خیال ہے اور یہ کم فہم بھی ان سے متفق ہے کہ سید والا گہر کی یہ نگارشات اپنی جگہ افسانہ ہیں۔ اگرچہ اس وقت تک اُردو ادب میں افسانے کی صنف رائج نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی تعریف متعین ہوئی تھی کہ اس کی بنیاد پر ان مضامین کو پرکھا جاسکتا، تاہم آج یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ ہر دو نگارشات ایک اچھے اور مکمل افسانے کی تمام شرائط کو پورا کرتی ہیں۔ بہر کیف اس موضوع پر علاحدہ سے گفتگو ہوسکتی ہے۔ سر دست اس کا محل نہیں۔

سید عالی رقم نے جن امور پر اظہارِ خیال کیا، جن موضوعات پر قلم آرائی فرمائی۔ ان کے اعتبار سے، ان کی زبان، موضوعات اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔ غالباً ان کی تحریروں کی اہمیت اس لیے بھی فزوں ہے کہ انھوں نے عصری تقاضوں، پیش قلم موضوعات، نیز اپنے

مخالفین کی عقل وفہم کے مطابق زبان اختیار کی۔

ایک بات بہ کثرت کہی جاتی ہے، تاہم اس کا اعادہ لازم ہے کہ سید والا سے قبل جو نثری اسلوب رائج تھا، اس میں تزئین، زیبائی اور حسن ظاہری پر ازحد اصرار تھا، لیکن سید مکرّم نے اس کے برعکس اپنے اسلوب کی ساخت و پرداخت میں اجتہادِ علمی سے کام لیا اور اپنے ہم عصر انشا پردازوں کے ادبی مذاق کے برعکس مقفّیٰ، مسجع، پُرتکلف اور نمائشی عبارت کے بجائے سہل، رواں نثر کو رواج دیا۔ اسی لیے ان کے مضامین میں سادگی کی روش نظر آتی ہے۔ حتّٰی کہ انھوں نے اپنے بعض تمثیلی مضامین میں بھی طرز شاعرانہ کی جگہ خالصتاً نثری اظہارِ بیان پر ہی توجہ مرکوز رکھی اور سادگیِ بیان کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مثال کے طور پر ان کے انشائیہ نما مضمون (یا افسانہ) 'امید کی خوشی' کا یہ اقتباس پیش کیا جاسکتا ہے:

''او نورانی چہرے والے، یقین کی اکلوتی بیٹی امید، یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت ہی دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل سے مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں''۔

(بحوالہ: مقالات سرسید: محمد عبداللہ خاں خویشگی)

قابل غور ہے کہ اگرچہ سید والا کی عام روش کے برخلاف اس عبارت میں الفاظ کی تکرار ہے، تاہم نثر کی ساخت میں ایک قسم کی لچک ہے، جس سے بیان میں روانی کارفرما رہتی ہے اور صراحت خیال بھی، جس سے مضمون کی اثر پذیری میں اضافہ ہوتا ہے۔ سید عالی اپنی بات واضح کرنے کے لیے دلائل کا استعمال بھی کرتے ہیں اور یہ دلائل و براہین بعید از قیاس نہیں ہوتے اور قاری کے ذہن میں جاگزیں ہوکر، اسے ان کے نکات سے اتفاق کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کے ان اوصاف کے ثبوت کے طور پر ان کے ایک انشائیے 'خوشامد' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دل کی جس قدر بیماریاں ہیں، ان میں سب سے مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہوجاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کرلیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوجاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آئند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کردیتی ہے، اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہوجاتی ہے۔''

(بحوالہ: مقالات سرسید: محمد عبداللہ خاں خویشگی)

علما و فضلا کی متفقہ رائے ہے کہ ذاتی مکتوب، راقم کے کردار، اخلاق نیز خیالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سید عالی کے مکتوبات کا جائزہ بھی تقاضائے موضوع ہے۔ ان کی دیگر نگارشات کی طرح، ان کے خطوط بھی صدہا ہیں، جن میں انھوں نے بے تکلّفی کے ساتھ تمام تر مذہبی، سیاسی و معاشرتی موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان خطوط کے مطالعے سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور ان کے کردار کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے اکثر خطوط میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی یہ ذاتی تحریریں ایک دل دردمند کے جذبات کا اظہار ہیں۔ ایک جانب ان کے خطوط میں ان کا عشق رسولؐ، جذبۂ ایمانی و جوش اسلامی عیاں ہے تو دوسری طرف معاشرے کے خرابات، ملّت مسلمہ کی بے حسی و اجتماعی مسائل سے لاتعلقی کا کہیں اجمالی اور کہیں مفصّل تذکرہ ہے۔ مثالیں بے شمار ہیں، جن کا اندراج اس نگارش مختصر میں ممکن نہیں، تاہم چند نمونے پیش کرنا لازم ہے۔ ان کے مذہبی نظریات پر کوئی کتنا ہی اعتراض کرے، مندرجہ ذیل مکتوب، ان کے اصل مذہبی خیالات کا مظہر ہے۔ وہ مولوی محمد حسین آزاد کو ایک خط میں رقم کرتے ہیں:

''اس بات کے کہنے سے مجھے معاف کیجئے کہ یہ خیال آپ کا کہ قرآن میں کوئی مضمون علمی نہیں، خالص فصاحت اس کا 'معجزہ' ہے درست نہیں ہے۔ قرآن علم و نیچر اور فصاحت سب سے معمور ہے اور مجموع من حیث المجموع معجزہ ہے''۔

(بحوالہ: مکتوبات سرسید: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

ضمناً عرض ہے کہ سیّد عالی نظر کی سب سے معروف، مؤقر اور مقبول تصنیف، 'خطباتِ احمدیہ' حب اسلام کے جذبات کا بہترین مظہر ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ مذہبی عقائد و بنیادی تعلیمات کو عقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ وہ دراصل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا کوئی اصول نہ غیر منطقی ہے، نہ غیر سائنسی اور نہ کسی طور پر خلاف فطرت۔ بطور ثبوت ان کی یہ نگارش کافی ہے:

''ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور نے جو کتاب آنحضرتؐ کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصّبات سے دل کباب ہے اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرتؐ کی سیرت میں سب کچھ خرچ ہو جائے اور میں فقیر، بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمدؐ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔ مارا ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است''۔

(بحوالہ: مکتوبات سرسید: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

اس تحریر میں سید محترم کا وہ جذبۂ ایمانی اور ان کا حب رسالت مآبؐ روز روشن کی طرح عیاں ہے جس کی مثال اوّلون، سابقون میں ملے تو ملے، ادوار مابعد میں تو اس کی تلاش لا حاصل ہے۔ محسن الملک کے نام انگلستان سے تحریر کردہ ایک مکتوب میں ان کا درد برائے ملّت یوں ظاہر ہوتا ہے:

''پس، مختصر حال و نتیجہ سفر یوروپ کا یہ ہے مگر ہماری قسمت میں جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب و تنزلِ موجودہ اور ذلّتِ آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کو ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے اس میں بھی وہ حماقت اور لایقینی اور گمراہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے، پس کوئی کیا کرے۔ بداقبالی و بدنصیبی کا کچھ علاج نہیں''۔

(بحوالہ: مکتوبات سرسید: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

اہم کتب کے تراجم بھی سید والا کا ایک بڑا کارنامہ ہیں ان میں فارسی کتب بھی ہیں، عربی کتب بھی اور انگریزی کتب بھی۔ کچھ ترجمے سید عالی نظر نے خود کئے، باقی سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے بعد اپنے رفقائے کار سے کرائے۔ دراصل سیّد مکرّم سے قبل فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج میں کچھ ترجمے ہوئے تھے، مگر ان سے قوم کی اصلاح مطلوب نہ تھی اور نہ ہی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا کوئی مقصد ان کے محرکین کے پیش نظر تھا، جبکہ سیّد عالی نے مغربی ادب اور مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ پایے کی تصانیف کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے (سائنٹفک سوسائٹی کے تحت) مجلس ترجمہ قائم کی۔ جس کے ذریعہ بڑے معیاری ترجمے کرائے گئے۔ تقریباً چالیس کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ یہ کتابیں اکثر اہلِ مغرب کی تصنیف کردہ تھیں۔

اب ذرا ایک بات روایت سے ہٹ کر۔ سیّد والا مرتبت کتنے ہی سنجیدہ اور بردبار ہوں ان کے مزاج میں شوخی اور طنز و ظرافت کا ایک عنصر کارفرما تھا، جس کی مثالیں ان کے خطوط میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خط میں وہ اپنے ایک رفیق سراج الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

''جانے دو، جس کا دل چاہے کہے۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اگر ہمارے برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے، خوش کر لینے دو۔ تم بھی ان کے برا کہنے پر خوش ہو، کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں۔ ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔''

(بحوالہ: مکتوبات سرسید: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

سید عالی فکر کا ایک وصف نادر ہے کہ ان کے یہاں صرف عمل ہی نہیں بلکہ قلم بھی پابند اخلاص ہے، دیانت قلمی ان کا شعار ہے۔ وہ اصولاً نثر میں صنعت گری کے قائل نہیں، بلکہ نثر کے فطری بہاؤ کے حامی ہیں اور اسی کو حقیقی تخلیق قرار دیتے ہیں۔ امر حیرت ناک تو یہ ہے کہ ان کی نثر، اپنی سادگی و سلاست کے باوصف، فطری انشا پردازی کے دلکش نمونوں سے مالا مال ہے۔ وہ اپنے مضامین میں تشبیہات و استعارات کا بھی استعمال کر گزرتے ہیں جس سے ایک قسم کی لطافت اور ایک قسم کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ حسب تقاضائے موضوع وہ اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کے لیے تمثیلات سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ ان کی نثر کا وصف ظاہری نہیں بلکہ حسن باطنی ہے۔

قابل غور ہے کہ سید عالی قلم کے یہاں موضوعات کا تنوع اور بیان کی وسعت پذیری ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے یہاں فنّی خامیاں بھی در آتی ہیں، لیکن دراصل یہ خامیاں نہیں بلکہ تقاضائے ضرورت ہیں، جن کا جواز نظر آتا ہے۔ حقیقت ہے کہ سید باتکریم بنیادی طور پر مصلح قوم ہیں اور اصلاح معاشرہ ان کا مقصد عین۔ ابتدائی مذہبی و تاریخی تصنیفات و تالیفات کے بعد ان کی تمام تر نگارشات، اخلاقی، معاشرتی یا سیاسی نوعیت کی ہیں۔ اس وقت ان کے پیش نظر زور بیان یا حسن انشا پردازی نہیں بلکہ اظہار واقعہ کا مسئلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ سیّد والا کی نگارشات محض ادبی نہیں بلکہ مقصدی ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم سے خوب کام لیا۔ ادب کو سامان شوق نہیں، بلکہ ذریعۂ اصلاح بنایا۔ اگرچہ ان کے دور تک یہ اصطلاح رائج نہ تھی، تاہم کہا جا سکتا ہے کہ 'وہ ادب برائے ادب' کے نہیں، 'ادب برائے زندگی' کے قائل تھے اور ان کے تمام رفقا و شاگرد، خواہ وہ حالی ہوں، شبلی ہوں، نذیر احمد ہوں یا عبدالحق، تمام تر ان کے موقف کے حامی، ان کے مقلّد اور ان کے پیغام کے علم بردار ہیں اور انہی کی برکات سے، ان کے اثرات کے تحت علی گڑھ ادبی تحریک پروان چڑھی۔ جس کے بطن سے سنجیدہ و مقصدی ادب پیدا ہوا۔ یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ادب کی کوئی تحریک ہو، خواہ رومانی تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک یا مابعد تحریک

جدیدیت۔ یہ تمام علی گڑھ تحریک کی رہین منّت ہیں۔ ان تمام تحریکات کے پرچم برداروں میں اہم نام وہ ہیں جو دانشگاہ سید کے تعلیم یافتہ، شہر علم کے تربیت یافتہ اور علی گڑھ تحریک کے پروردہ تھے۔ صرف چند نام لیں تو سجاد حیدر یلدرم، رشید احمد صدیقی۔ سردار جعفری، عصمت چغتائی، معین احسن جذبی، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے اسمائے گرامی گنائے جاسکتے ہیں کہ ان سب کے دلوں میں علی گڑھ ہی دھڑکتا سنائی دیتا ہے۔

دراصل دبستان سیّد، ان سب حالات وکوائف کا ردِّعمل تھا۔ ان کے دبستان کو عقلی وفکری دبستان قرار دینا چاہیے۔ مغربی فکر سے استفادے اور اپنی عقلیت پسندی کی اساس پر سید والا نے اس ادبی تحریک کی عمارت تعمیر کی، جس کو بعد ازاں علی گڑھ تحریک سے موسوم کیا گیا۔ انھوں نے مغربی خیالات سے کماحقّہٗ استفادہ کیا۔ علی گڑھ کالج کو انھوں نے تحریک کا مرکز بنا کر اپنے کام کا آغاز کیا۔ ان کی تحریروں کے موضوعات، نیز ادب کی تمام اصناف کے ضمن میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی رائے ملاحظہ ہو:

''ہمارے ملک میں سرسیّد ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادیِ موضوع اور آزادیِ اسلوب کی رسم جاری کی اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی، جس کے عقائد میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے''۔

(بحوالہ: سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنّی اور فکری جائزہ: ڈاکٹر سید عبداللہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہی ایک اور اقتباس:

''آج کا ترقی پسند ادب بھی سرسیّد کا مرہونِ منّت ہے۔ یہ سرسیّد کی عقلیت، مادیت اور حقائق نگاری ہی کی ہم جنس اور اس کی ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتی ہے۔ ادب کی تمام اصناف، مثلاً صحافت، مضمون یا مقالہ نویسی، تاریخ نویسی، مذہبی کتب، تراجم، ادبی تنقید، قصہ نگاری، ناول نویسی اور سوانح عمری نے سرسیّد تحریک کے زیرِ اثر نیا رنگ وآہنگ اختیار کیا۔''

(بحوالہ: میرا مّن سے عبدالحق تک: ڈاکٹر سید عبداللہ)

اس حقیقت سے کون کافر انکار کرے گا کہ سید عالی وقار نے اپنے جاری کردہ جرائد سے قوم وملک کی ایک ایسی خدمت عظیم انجام دی، جس کی مثال ماضی میں نظر نہیں آتی۔ اس باب میں وہ خود یوں رقم طراز ہیں:

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیِ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارہ خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شان صرف لفظوں ہی میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، نثر کیا تُک بندی ہے جو اس زمانے میں مقفّیٰ عبارت کہلاتی ہے، ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگیِ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے''۔

(بحوالہ: تہذیب الاخلاق)

واقعتاً ان کی یہ تحریر ان کے اسلوب نگارش کا منشور ہے اور ان کے طرز بیان کا اعلانیہ۔ سید عالی رقم کے اوصاف اسلوب وطرز بیان کے ضمن میں ان کے رفیق خاص مولانا الطاف حسین حالی کی درج ذیل رائے، ان کے محاسن تحریر کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''سرسیّد کے ہاں ہر مقام کے مقتضا کے موافق ان کی تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر ان کے علمی وتاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ جیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرانی کا سا زور۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے اور بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت، خوش طبعی۔ نصیحتیں، نشتر سے زیادہ دل خراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں''۔

(بحوالہ: مقالات حالی: خواجہ الطاف حسین حالی)

سید والا نے اس امر پر کافی غور وخوض کیا تھا کہ ایک مثالی صحافی کیسا ہونا چاہیے اور ایک کامل صحافی کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس ضمن میں ان کا ہی ایک اقتباس ان کے نقطۂ نظر کی فہم میں مددگار ہوسکتا ہے۔

''ایک معزز اخبار نویس کا یہ کام ہے کہ وہ گورنمنٹ کی تدابیر کی نسبت معقول طور سے نکتہ چینی کر کے اس کو صلاحِ نیک دے اور مختلف دلچسپ معاملات کا ذکر کر کے ان خرابیوں کو رفع کرے جو ان کی حالتِ معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ پس اخبار کے لکھنے والے کے فرائض کسی طرح آسان یا ناچیز نہیں ہیں۔ اس کے فرائض دو قسم کے ہوتے ہیں، یعنی وہ صلاح دینے والا اور تربیت کرنے والا ہوتا ہے''۔

(بحوالہ: علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ)

ذرا غور فرمائیے کہ سید عالی کی یہ بالغ نظرانہ رائے تقریباً ڈیڑھ صدی پرانی ہے۔ تاہم اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ یہی ہیئتگی تو سید والا کا

وصف عالی ہے۔

سید والا کی تحریر کے محاسن، ان کے اسلوب، ان کے طرز نگارش، نیز ان کے نظریۂ ادب پر طول طویل مذاکرے ہوتے ہیں، مضامین ہی نہیں، مستقل کتب تصنیف ہوتی ہیں، مگر ان کی تحریر کے عیوب پر احتیاطاً، مصلحتاً یا تکلّفاً بہت کم بحث ومباحثہ ہوتا ہے، شاید اس کا سبب مدّاحان سید کی (ان کے تئیں) عقیدت ہو، تاہم یہ طریق عمل آداب علم وادب کے منافی ہے۔ اگر کسی بھی قدآور شخصیت کی تصانیف میں کوئی خامی ہے تو ادبی ایمانداری اور علمی دیانت داری کے طفیل اس پر بھی کشادہ ذہنی، وسیع القلبی، نیز جرأت دانشورانہ کے ساتھ گفتگو ہونا چاہیے۔ سردست اس باب میں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں، بہرکیف اس ضمن میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی رائے پیش کی جاسکتی ہے۔

''سرسیّد کے مضامین کی کمزوری کا سبب یہ ہے کہ وہ محض مصلح ہیں، انھوں نے اصلاحِ اخلاق کے لیے ادبی ذرائع پر زیادہ اعتماد نہیں کیا، اصولاً ادب اور اخلاق میں کوئی تضاد نہیں، مگر اخلاق کی کھلی تلقین ایک غیر ادبی طریقۂ خطاب ہے۔ انگریزی زبان کے بلند پایہ مضمون نگار پہلے ادیب تھے، پھر مصلح، مگر سیّد صاحب سب سے پہلے مصلح پھر کچھ اور تھے۔ اس کی ذمہ داران کی مقصدیت اوران کے زمانے کا ماحول تھا''۔

(بحوالہ: سرسید احمد خاں اوران کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنّی اورفکری جائزہ: ڈاکٹر سید عبداللہ)

سید بالا جہات کے اسلوب نگارش پر اگر اعتراضات کئے جاتے ہیں، تو ان کے جنبہ دار، ان کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہی یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سرسیّد کی تحریر کے فقرے لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ آپ نے جابجا انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ بہت سے ناقدین انگریزی الفاظ کے استعمال کو ان کی خامی بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا غلط ہے۔ درحقیقت یہ خامی نہیں بلکہ ان کی لیاقت اور قابلیت کا مظہر ہے۔ چونکہ اردو زبان مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے، اس کا ذرّہ ذرّہ ہر زبان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس لیے سرسیّد نے انگریزی الفاظ کا استعمال کر کے زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے اور اردو زبان کو زندہ زبان بنانے کی کوشش کی ہے۔''

(بحوالہ: سرسید احمد خاں اوران کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنّی وفکری جائزہ: ڈاکٹر سید عبداللہ)

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اُردو ادب پر سید عالی مقام کے احسانات بھی ہیں اور ادب کی تمام اصناف پر ان کے وسیع تر اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری تو خیران کا شغل خاص تھی، مگر ان کی فکر اور ان کے طرز بیان کے اثرات، اُردو نثر کے علاوہ اردو نظم پر بھی مرتسم ہوئے اور اُردو تنقید پر بھی۔ یہی نہیں تاریخ نویسی پر بھی ان کی فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کے حلقۂ اثر میں ہر فن اور ہر شاخ علم کے افراد فرید شامل تھے۔ مثلاً حالؔی (تنقید اور نظم) شبلؔی (تاریخ وسوانح) نذیر احمد (تخلیقی واصلاحی ادب) عبدالحق (زبان وادب) وغیرہم اور اس کے علاوہ ان کے شاگردان معنوی کی فہرست اور بھی طویل ہے۔ جن میں رشید احمد صدیقی قاضی عبدالغفّار، مہدی افادی اور ذاکر حسین نمایاں طور پر شامل ہیں، جو سب اپنی ذات میں ایک مکتب فکر اور دبستانِ ادب تھے۔ اس حقیقت کا اعادہ بھی لازم ہے کہ سید عالی قلم کے اثرات محض اصناف ادب، نیز موضوعات تحریر تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے طرز نگارش اور سادہ مگر پرکار اسلوب نے بھی آنے والی نسلوں کو متاثر کیا، جس کے اثرات ان کے بعد کے ادب پر نمایاں ہیں۔

سید عالی نگارش کا معاملہ عجب ہے، ان کے یہاں نہ طلسم خیال ہے، نہ لفظی شعبدہ گری، وہ نہ میر امّن کی طرح باغ وبہار عبارت رقم کرتے ہیں، نہ رتن ناتھ سرشار کی طرح ان کے یہاں لفظی لطافت کی جادوگری ہے اور نہ ہی وہ محمد حسین آزاد کے مثل سحر کارانہ انشا پردازی کے وکیل ہیں، اس کے باوجود ان کے یہاں سادگی میں پرکاری کا جو ملکہ ہے، وہ اپنی جگہ بے مثال ہے:

غیر ممکن، تری مثال آئے

اتمامِ نگارش کے طور پر عرض ہے کہ سیّد عالی فکر، عالی نظر وعالی قلم، سیّد والا گہر اردو کے ایسے قدآور ادیب، صحافی و مدیر ہیں جن کے زیرِ سایہ مجاہدین قلم کی ایک فوج ظفر موج نے تربیت حاصل کی، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر ان سب نے ادب وصحافت کے میدان میں امتیاز حاصل کیا اور اپنی اہمیت ایک زمانے سے منوائی، اس کہکشاں میں مولانا حالؔی، علامہ شبلؔی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، وحیدالدین سلیم پانی پتی اور مولوی عبدالحق جیسے ضوفشاں ستارے جلوہ ساماں ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ آفتاب وماہتاب ہے، علم وفن کی ایک قوسِ قزح ہے جس کے سات نہیں ستّر رنگ ہیں، جن کی چھوٹ صدیوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی کہ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ سرِدست سیّد عالی مقام اوران کے تمام رفقا کے قلم کی پائندگی کے اعتراف کے ساتھ ان کی خدمات میں بہ اخلاص خراجِ تحسین کہ اس مختصر نگارش میں اس سے زیادہ ممکن نہیں:

جو کچھ کہا تو ترا حسن ہوگیا محدود

○○